بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ”عربی حروف میں فرنگی زبان“

# کے ”جائزہ“ کا ”جائزہ“

محمد ذیشان مئوی قاسمی

فاضل دار العلوم دیوبند

# عرض راقم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

**نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد:**

قابل صد احترام حضرت مولانا محمد نوشاد نوری صاحب قاسمی کے جائزہ کی قسط اول کو پڑھ کر راقم کے دل میں جو تاثر قائم ہوا وہ یہ کہ حضرت مولانا نے مؤلف کی کتاب کو اکابر کی زبان دانی پر حملہ تصور کر لیا۔ جس سے وہ جذبات میں آگئے، اور شدت جذبات میں وہ کتاب اور اس کے دلائل کا بغور مطالعہ نہ کر سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ وہ اپنے جائزہ میں جگہ جگہ تسامحات و زلات کا شکار ہو گئے۔ اور بعض مقامات پر تو ایسا بھی ہو گیا کہ مؤلف نے ایک بات کو ذکر کیا ہے؛ لیکن سرسری مطالعہ کی وجہ سے وہ مولانا کی نظروں سے اوجھل رہ گئی اور وہ مؤلف پر عدم ذکر کا بہتان باندھ گئے۔ اور کہیں کہیں غضب ڈھا دیا ہے کہ مؤلف نقد تو کسی اور بات پر کر رہے ہیں؛ لیکن اس اصل نقد کو چھوڑ کر وہ کسی اور ہی بات پر معترض ہونے لگے۔

حضرت مولانا کے جائزہ میں اعتراض چونکہ مؤلف کتاب اور ان کی کتاب پر ہے؛ اس لیے اس کا دفعیہ اور صفائی بھی اصلاً مؤلف کے ذمہ تھا؛ لیکن راقم کو معلوم ہوا کہ مؤلف کتاب سفر پر ہیں اور ان کی واپسی ایک ہفتہ کے بعد ہی ہو سکے گی، تو محض اس داعیہ اور جذبہ کے پیشِ نظر کہ یہ اعتراضات چونکہ اس کتاب پر ہیں جس میں قرآن و حدیث کی عربی اور قدیم عربی کا دفاع کیا گیا ہے اور اہل فرنگ و مستشرقین کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے، راقم نے اپنے قلم کو زحمت تحریر دی اور مباحثہ کی اس وادی پر خار میں اس کی آبلہ پائی پر تیار ہو گیا۔

راقم کا یہ جائزہ عارضی اور وقتی ہے۔ باقی اصل جائزہ جو راقم کے جائزہ سے کہیں زیادہ دلائل و براہین سے آراستہ اور کلیات و جزئیات کو محیط ہو گا خود مؤلف کتاب ہی کی طرف سے بہت ہی جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔

فانتظروا إني معكم من المنتظرين.

# مقصد جائزہ

حضرت مولانا ہی کی تعبیر میں، اس "جائزہ کے جائزہ" سے میرا مقصود بھی "نہ کسی کی ذاتی مخالفت ہے اور نہ کسی پر بلاوجہ لعن طعن کرنا؛ بلکہ ان تبصروں پر کچھ اظہار خیال ہے جن پر" مولانا نوری صاحب کے جائزہ" کی عمارت کھڑی ہے، امید ہے کہ اس جائزہ کے جائزہ کو اسی تناظر میں دیکھا جائے گا۔

چونکہ دارالعلوم دیوبند کے بعض متخصصین فی الأدب العربي کا حضرت مولانا کے اس جائزہ پر یہ تبصرہ ہے کہ انہوں نے "جو معیار متعیّن کیا ہے وہ تو انتہائی کمزور ہے، البتہ (مفکر اسلام حضرت مولانا) علی میاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی مثالوں کو لے کر (مفتی) ہدایت اللہ صاحب کا جو تعاقب کیا ہے وہ بظاہر درست معلوم ہوتا ہے"۔

اس لیے ہم پہلے ان مثالوں کے تبصرے پر اپنا جائزہ اور تبصرہ پیش کرتے ہیں، پھر بقیہ باتوں پر جائزہ اور تبصرہ پیش کریں گے۔

(ملاحظہ: "مثال" کے عنوان سے "عربي حروف میں فرنگی زبان" کتاب کی مثالوں کو پیش کیا جائے گا۔ پھر "تبصرہ" کے عنوان سے حضرت مولانا نوری صاحب کے اس مثال پر تبصرے کو پیش کیا جائے گا اور "تبصرہ بر تبصرہ" کے عنوان سے راقم کی عبارت ہوگی)۔

# مثالیں اور تبصرے
# اور
# تبصرے بر تبصرے

**پہلی مثال:** لفظ "الإنسانية" فرنگی تعبیر "humanity" کا لفظی ترجمہ ہے۔ انگریز نے "human" کا مصدر "humanity" بنایا۔ پھر مصدر کو مطلق انسان کے لیے استعمال کیا۔ اہل عرنگی نے بھی انگریز کی تقلید میں انسان کا مصدر صناعی "انسانیۃ" بنایا، پھر مصدر کو مطلق انسان کے معنی میں رائج کر دیا جو کہ لغوی تحریف ہے۔ (کتاب مؤلف ص:۴۳۷)

**تبصرہ:** "الإنسانية" کا لفظ خالص عربی تعبیر ہے۔ جسے وہم ہو وہ قدیم عربی معاجم میں اس لفظ کو دیکھ سکتا ہے۔ قدیم معاجم میں یہ لفظ عام طور سے شرافت اور مروءت کے معنی میں آیا ہے، انسانیت کے معنی میں کم ہے؛ لیکن انسانیت کے مفہوم میں بھی اس کا وجود قدیم معاجم میں ہے۔ (نوری جائزہ صفحہ نمبر ۱۴)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** مؤلف کتاب نے لفظ "الإنسانية" کو "انسانیت" کے مفہوم میں رکھنے پر کوئی اعتراض ہی نقل نہیں کیا۔ اعتراض تو یہ ہے کہ: "مصدر کو مطلق انسان کے معنی میں رائج کر دیا جو کہ فرنگی تعبیر اور لغوی تحریف ہے"۔ اس پر آپ کا تبصرہ ندارد ہے۔

**تبصرہ:** اب لطیفہ سنیے: مصنف نے احمد الغامدی کی کتاب کا حوالہ دے کر جس تعبیر کو عرنگی تعبیر کہا اور لغوی تحریف کہہ دیا، احمد الغامدی نے اسے صرف غریب کہا ہے۔ احمد الغامدی کے الفاظ ملاحظہ ہوں: «**ولو تأملت هذا الاستعمال لوجدت غرابته كغرابة قول قائل: لابد أن تجتمع الآدمية**» (ص۱۰۷)۔

اب بتائیے جس کتاب کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہاں تحریف کا لفظ ہے اور نہ عرنگی کا، تو انصاف سے بتائیے یہ تحقیق ہے یا تحقیق کے نام پر تحریف؟ (جائزہ ص ۱۵)

**تبصرہ بر تبصرہ:** اب ہم سے بھی لطیفہ سنیے: شیخ ترجمان احمد الغامدی نے کہا ہے کہ "الإنسان کی جگہ الإنسانیة کا استعمال ایسے ہی نامانوس اور عجیب و غریب ہے جیسے کہ انسان کی جگہ الآدمیة کا استعمال" تو شیخ نے اس کے استعمال کو غریب تو کہا ہے؛ لیکن صرف غریب نہیں کہا اور جب انہوں نے حصر نہیں کیا تو اس کے فرنگی تعبیر اور لغوی تحریف ہونے کی نفی کیسے ہو گئی؟

پھر جب شیخ ترجمان احمد الغامدی نے اپنی کتاب کا نام ہی "العرنجیة" رکھ دیا یعنی اس کتاب میں "عربی حروف میں فرنگی زبان" اور عرنگی تعبیرات کو بیان کیا گیا ہے، تو اب کیا ہر ہر لفظ کے تعلق سے انہیں الگ سے یہ کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ جناب! یہ بھی فرنگی تعبیر ہے اور یہ بھی عرنگی تعبیر ہے؟ بلکہ ان کا اس لفظ کو اٹھا کر اس پر کلام کر دینا ہی اس کی فرنگیت کے لیے کافی ہے۔

اب آپ انصاف سے بتائیے کہ ہم آپ کی اس تحقیق کو تحقیق کہیں یا تحکیک؟

**دوسری مثال:** وفقد رشدہ و قوة التمییز. یہ فرنگی تعبیر ہے۔ عربی میں "کھونے" کے مفہوم میں حسب مواقع درجنوں الفاظ ہیں اور انگریزی میں "lost" آتا ہے۔ اہل عرنگی نے تمام عربی الفاظ کو چھوڑ کر "lost" کے ترجمے میں "**فقد**" ہی کو رائج کر دیا جو کہ محض تقلیدِ انگریز ہے۔ (صفحہ نمبر ۴۳)

تبصرہ: اس تعبیر پر اعتراض ہے کہ یہ انگریزی کے "lost" کا ترجمہ ہے۔ اگر انگریزی کے کسی کلمے کا عربی کے کسی کلمے سے ترجمہ کیا گیا تو وہ لفظ انگریزی کیسے ہو گیا؟ (ص ۱۵)

**تبصرہ بر تبصرہ:** "ترجمہ" اور ہے، اور "طرز ادا و تعبیر" اور۔ ایک ادیب کے لیے دونوں میں فرق واضح اور بین ہے۔ مؤلف کا اصل اعتراض عربی ترجمے پر ہے ہی نہیں۔ خود آپ نے جو مؤلف کی عبارت نقل کی ہے اسی میں غور فرمالیں کہ مؤلف نے لکھا ہے کہ: "یہ فرنگی تعبیر ہے" یہ نہیں کہا کہ "یہ انگریزی کا عربی ترجمہ ہے"۔

پھر مؤلف نے اصل اعتراض کو اس مقام پر قدرے اختصار سے ذکر کیا ہے اس لیے کہ وہ ماقبل میں اس پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ ہم وہاں کی گفتگو حاضر خدمت کرتے ہیں، اس سے اصل

اعتراض واضح ہو جائے گا۔

مؤلف صفحہ نمبر ۴۱۵ پر فرماتے ہیں کہ: "ایک مفہوم کے لیے مختلف مواقع کے اعتبار سے مختلف الفاظ تھے مگر ان میں سے جو لفظ فرنگی زبان کے موافق ہوا اسے رائج کر دیا اور باقی سب الفاظ کو ترک کر دیا مثلاً "کھونے، نہ ہونے" کے مفہوم میں عربی میں حسب مواقع مثلاً دس الفاظ ہیں ان میں سے ایک لفظ "فقد" بھی ہے۔ چونکہ انگریز ان سبھی مواقع میں ایک لفظ "lost" ہی استعمال کرتے ہیں، تو جدید عربی والوں نے ان دس میں سے نو الفاظ کو ترک کر کے ایک "فقد" ہی کو "lost" کے ترجمے میں رائج کر دیا۔ جیسے:

| اصل عربي | انگریزی | جدید عربي |
|---|---|---|
| يَئِسَ زيد، أو قَنطَ. | Losthope | فقدالأمل |
| خرج الأمر من يده. | LostControl | فقدالسيطرة |
| أُعْمِيَ على زيد. | Lostconsciousness | فقدوعيه |
| رَغِبَ عن الناس. | Lostinterest | فقداهتمامي بالجميع |
| نقص شأنه أو حُط. | Lostitsvalue | فقدقيمته |
| فُضّتْ بكارتها. | Losthervirginity | فقدت عذرتها |
| افترِعَتْ عُذْرتُها. | Losthervirginity | فقدت عذرتها |
| فَقَدَتْ عِقْدَ. | Losthernecklace | فقدت قلادتها |

ان جملوں میں عربی زبان کے دس افعال آئے ہیں اور ان دسوں افعال کے لیے انگریزی کا ایک ہی فعل آیا ہے تو جدید عربی میں بھی ان دسوں افعال کے لیے ایک ہی فعل آیا ہے "(ص ۴۱۶)۔

حاصل اعتراض یہ ہے کہ "ہر مفہوم میں عربی کے درجنوں الفاظ و تعبیرات ہیں لیکن ان کو صرف اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہ فرنگی قالب سے میل نہیں کھا رہے تھے اور ان کی جگہ ان الفاظ و تعبیرات کو رائج کر دیا گیا جو فرنگی اور انگریزی قالب کے موافق تھے اور لفظی ترجمے کے قابل تھے" (ص ۳۱۳)۔

**تبصرہ:** "رہ گئی یہ بات کہ اس مفہوم کے تمام الفاظ کو عربوں نے چھوڑ کر اسی لفظ کو رائج کر دیا تو یہ دعوی غلط ہے۔ یقین نہ آئے تو اس کے ہم معنی الفاظ کو عربی مجلات اور اخبارات میں تلاش کیجئے۔ نہ ملے تو مجھ سے رابطہ کیجئے"۔ (ص:۱۶)

**تبصرہ بر تبصرہ:** حضرت مولانا زید مجدہم رہنمائی بھی ایسے مرجع و مآخذ کی طرف فرما رہے ہیں جو عرب علماء کے یہاں معتبر ہی نہیں، چنانچہ ڈاکٹر محمد دہوزی "واقع اللغة العربية في وسائل الإعلام" میں لکھتے ہیں: «يمكن القول بأن وسائل الإعلام شوهت اللغة العربية و قوضت قواعدها» (یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ نے ہی عربی زبان کو بگاڑا اور اس کی بنیادوں کو اکھاڑا ہے)(کتاب مؤلف ص ۱۶۹)۔

خیر، ان مآخذ غیر معتبرہ میں تو ہم تلاش کرنے سے رہے؛ لہذا اس تحریر کے ذریعے ہم آپ ہی سے رابطہ کرتے ہیں کہ آپ ہی ایسے ہم معنی الفاظ ارسال فرما دیں۔

**تبصرہ:** "ہم نے مان لیا کہ عربوں نے اس کے دوسرے معانی چھوڑ دیے تو اس میں حضرت مفکر اسلام کی غلطی کیسے ہو گئی؟"

**تبصرہ بر تبصرہ:** مؤلف ہی کا کب دعوی ہے کہ مطعون ہمارے اکابر ہیں، بلکہ مؤلف تو بڑی ہی صفائی سے انہیں بچا لے گئے ہیں۔ چنانچہ صفحہ نمبر ۴۳۵ پر لکھتے ہیں کہ: "ہمارے عجم کے ادباء مثلاً حضرت (مولانا) علی میاں صاحب ندوی یا حضرت مولانا وحید الزماں صاحب یا حضرت

مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی رحمہم اللہ ان حضرات نے نہ تو اپنی طرف سے کسی غلطی کو ایجاد کیا ہے اور نہ اپنی طرف سے کسی فرنگی ترکیب کو گھڑا ہے بلکہ ان حضرات نے عربوں سے حسن ظن کی بنا پر عربوں کی ہر فرنگی ترکیب اور ہر لسانی غلطی کو قبول کیا۔ پھر یہ غلطیاں ان کی تحریروں کے ذریعے بر صغیر کے مدارس میں عام ہو گئیں۔ اللہ تعالی ان حضرات کو ان کے حسن نیت کا ثواب ضرور عطا فرمائیں گے۔ البتہ ہم خردوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے ان حضرات کی کتابوں اور تحریروں سے جو فرنگی عربی اور لسانی تحریفات اور غلطیاں پھیل گئی ہیں ہم ان سے آگاہی حاصل کریں اور دوسروں کو بھی ان سے آگاہ کرنے کی سعی اور کوشش کریں۔ (ص ۴۳۵-۴۳۶)

**تیسری مثال**: انسحب رجال الدين من ميدان الحياة: "یہ لغوی غلطی ہے۔ عربی میں "فوج وغیرہ کے میدان سے ہٹنے" کے مفہوم میں: نكص، تقهقر، ارتد، وغیرہ آتے ہیں اور "انسحب" کے معنی ہیں: کھنچنا، گھسٹنا۔ سحب الشيئ فانسحب أي: جره فانجر لہٰذا میدان سے ہٹنے کے مفہوم میں اہل عرنگی نے "انسحب" کو غلط رائج کر دیا اور یہ اسی سے ماخوذ ہے۔ (ص ۴۳۷)

**تبصرہ**: "انسحب" گھسٹنے کے معنی میں آج بھی مستعمل ہے۔ جسے وہم ہو لغت کی مراجعت کرے۔ (ص ۱۶)

**تبصرہ بر تبصرہ**: مؤلف کو نہ کوئی وہم ہے، اور نہ اس کے دفع کے لیے مراجعت کی ضرورت؛ بلکہ ہمیں تو بصد احترام آپ سے درخواست کرنی پڑ رہی ہے کہ آپ تبصرے سے پہلے مؤلف کے اعتراض اور اصل نقد کی بار بار مراجعت کر لیں تاکہ آپ اس وہم سے محفوظ رہ سکیں کہ نقد تو کسی اور بات پر ہو رہا ہو اور آپ تبصرہ کسی اور بات پر کر رہے ہوں۔ چنانچہ مذکورہ مثال میں آپ کا یہ تبصرہ کہ "انسحب گھسٹنے کے معنی میں آج بھی مستعمل ہے جسے وہم ہو لغت کی مراجعت کرے" اسی وہم کا غماز ہے؛ کیونکہ مؤلف کا اعتراض یہ نہیں ہے کہ "انسحب" گھسٹنے کے معنی میں مستعمل ہے یا نہیں؟ وہ تو صاف کہہ رہے ہیں کہ "انسحب" کے معنی ہیں کھنچنا، گھسٹنا" ان کا اصل نقد اس

پر ہے کہ "میدان سے ہٹنے کے مفہوم میں نکص، تقھقر، اور ارتد کو چھوڑ کر اہل عرنگی نے انسحب کو غلط رائج کر دیا اور یہ اسی سے مأخوذ ہے"۔

**تبصرہ**: میدان سے پیچھے ہٹنے اور گھسٹنے میں معنوی قربت ظاہر و باہر ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر احمد مختار کی کتاب "معجم الصواب اللغوی" میں ہے: «والصلة واضحة بين هذا المعنى و معنى التراجع والتقهقر. وقد سجلت المعاجم الحديثة كالوسيط والأساسي هذا الاستعمال الجديد، وشاع على أقلام الكتاب بمعنى قريب كقول ميخائيل نعيمه: انسحبت من العالم الخارجي وقول نجيب محفوظ: بحث عن وسيلة لبقة ينسحب بها من المجلس»

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ نے بنیاد بنایا "معجم الصواب اللغوی" کو، جبکہ اس کتاب کے تعلق سے پانچویں مثال پر تبصرے کے ذیل میں صفحہ نمبر ۲۰ پر آپ نے خود لکھا ہے کہ "مستعمل غلط کلمات کی اصلاح کے لیے لکھی گئی ہے" اور واقع و نفس الأمری میں یہ بات سچ اور صحیح بھی ہے؛ کیونکہ خود مؤلف نے بھی اس کتاب کے مقدمہ میں یہی لکھا ہے کہ یہ کتاب مستعمل غلط کلمات کی اصلاح کے لیے لکھی گئی ہے حالانکہ درحقیقت وہ اصلاح نہیں ہے بلکہ تاویل ہے جیسا کہ اسی عبارت «والصلة واضحة بين هذا المعنى ومعنى التراجع والتقهقر» سے واضح ہے؛ کیونکہ ان عبارات کے ذریعے "مؤلفِ معجم" اصلاح تھوڑی کر رہے ہیں وہ تو تاویل کر رہے ہیں اور یہ تاویلات کہیں کہیں رکیک اور بارد بھی ہو جا رہی ہیں۔

الغرض، جس کتاب کا مقصد ہی فرنگیوں کے پھیلائے ہوئے غلط کلمات کو تاویلات رکیکہ و باردہ کے ذریعے کھینچ تان کر درست قرار دینا ہو، وہ کتاب قدیم عربی کے باب میں قابل اعتبار کس طرح ہو سکتی ہے؟

پھر لطف یہ ہے کہ آپ نے بنیاد بنایا "معجم الصواب اللغوی" کو اور انہوں نے بنیاد بنایا معاجم حدیثہ، میخائل نعیمہ اور نجیب محفوظ کے قول کو، یہ بناء تو «بناء الفاسد علی الفاسد» کی قبیل سے ہو رہی ہے؛

اس لیے کہ میخائل نعیمہ خود جبران خلیل جبران کے اثر سے عربی کی تحریک جدیدیت میں حصہ لینے والا ہے۔ اور نجیب محفوظ جو کہ جدید مصری ناول نگار ہے طہٰ حسین جیسے مستشرقین کے پروردہ، اسلام کے کٹر دشمن اور سلامہ موسی جیسے اسلام، قرآن اور عربی زبان کے بڑے دشمن اور انگریزی ناول نگار جیمز جوائس اور فرانسیسی مضمون نگار مارسل پروست جیسے اشخاص سے متاثر اور ان کا رسیا رہا ہے۔ (ویکیپیڈیا)

**تبصرہ:** مصنف نے اپنی بات اسعد خلیل داغر کی کتاب "تذکرة الکاتب" اور جودة مبروک کی کتاب "المعجم الوجیز فی الأخطاء الشائعة" کے حوالے سے کہی ہے، دونوں کتابوں میں سے کسی میں بھی اس کو لغوی غلطی نہیں کہا گیا ہے..... ہاں یہ صراحت ہے کہ یہ لفظ مُحدَث ہے یعنی اس معنی میں اس کا استعمال نیا ہے۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** سبحان اللہ! کیا "لغوی غلطی" اور "محدث ہونے" میں کوئی منافات ہے؟ جب ان دونوں کتابوں میں اسے مُحدَث اور نیا کہہ دیا گیا تو اس کا صاف اور واضح سا مطلب یہی تو نکلتا ہے کہ قدیم لغات میں یہ لفظ اس معنی میں ہے ہی نہیں اور جب ہے ہی نہیں تو اس لفظ کو اس معنی میں لینا لغتاً غلط اور خطا ہی تو قرار دیا جائے گا۔

**تبصرہ:** کثرت استعمال اور لغوی اکیڈمی اور متخصصین کے طے کرنے کے بعد اب کیا غلطی رہ گئی؟ (جائزہ ص ۱۷)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** یہ کہنا بجائے خود غلطی ہے؛ اس لیے کہ کثرت استعمال انہی لغوی اکیڈمیوں اور ان کے متخصصین کے طے کرنے کی وجہ سے ہوا ہے اور معاجم حدیثۃ بھی انہی کی ضبط کردہ ہیں اور ان لغوی اکیڈمیوں پر جن متخصصین کا قبضہ ہے وہ مستشرقین اور ان کے سڑے ہوئے مقلدین ہیں۔

چنانچہ ابو نصر محمد بن عبداللہ الامام اپنی کتاب «المؤامرة الغربیة علی اللغة العربیة» میں رقم طراز ہیں: «تمکن المستشرقون أن یتسللوا إلی المجمع اللغوي في مصر......الخ.»

(یعنی: مستشرقین مصر کی مجمع اللغۃ، دمشق کی مجمع اللغۃ اور بغداد کی مجمع اللغۃ میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے)۔ چنانچہ سن ۱۹۲۱ء میں دمشق کی مجمع میں ۶۶ مستشرق ممبران تھے جو فرانس، اٹلی، برطانیہ، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ اور اسپین وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مصر کی مجمع میں ۷ استشرق ممبران تھے جو فرانس، اٹلی، برطانیہ، لاووست اور رینبرگ وغیرہ کے باشندے تھے۔ جن میں فرانس کا "لویس ماسینیون" نامی شخص اسلام کا خطرناک دشمن تھا۔ ابو نصر محمد بن عبداللہ الامام نے ان سب کو نام بنام ذکر کیا ہے۔

اور پھر یہ تعداد بھی سو سال پہلے کی ہے جب مجامع میں مستشرقین کی صرف شمولیت ہوتی تھی؛ مگر بعد میں ان مجامع پر مستشرقین کا مکمل قبضہ ہو گیا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر فہد خلیل زاید نے اپنی کتاب «**العربية بين التغريب و التهديد**» میں لکھا ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: شروع میں قاہرہ کی مجمع اللغۃ العربیہ میں کچھ اچھے لوگ تھے؛ مگر بعد میں جب اخباری عربی والوں نے اس کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے مجمع کو عامی زبان کی اہمیت بتائی اور فصیح عربی زبان پر جمود اور زمانے کے ساتھ چلنے سے اس کے عاجز ہونے کا الزام لگایا)۔

ابو نصر محمد بن عبداللہ الامام آگے لکھتے ہیں: «**إن المستشرقين تسللوا إلى بعض المجامع اللغوية الإسلامية، ليتمكنوا من افسادها و لينشروا من خلالها ما يحاربون به اللغة الفصحى، و من هذه المجامع مجمع اللغة في القاهرة**» (مستشرقین بعض لغوی اسلامی مجامع میں گھس گئے؛ تاکہ وہ ان کو برباد کر سکیں اور فصیح عربی زبان کے خلاف زہریلے مواد شائع کر سکیں۔ ان مجامع میں سے قاہرہ کی مجمع اللغۃ بھی ہے)۔

...بے شمار مستشرقین اور ان کے چیلے عالم عرب کی مجامع پر قابض تھے اور آج بھی ہیں جن کو مختلف علماء نے تفصیل و تحدید کے ساتھ اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

آج مجامع اللغہ کے تقریبًا سبھی ممبران «**إلا ما رحم ربي**» مستشرقین یا ان کے چیلے ہیں۔ یہ سب بھیڑیے نما انسان پہرے دار بن کر مجامع اللغہ میں گھسے ہوئے ہیں اور عربی زبان کی کھال اتار کر اس

کا مثلہ بنانے اور عربی زبان کو فرنگی قالب میں ڈھالنے میں مصروف ہیں۔ جو بھی غلطی مشہور اور عام ہو جاتی ہے سب مل کر اس کو پاس کر دیتے ہیں۔ اگر ۹۹ دلیلیں یہ کہیں کہ یہ غلط ہے اور ایک "شاذ قول" سے اشارہ مل جائے کہ یہ جائز ہے تو یہ لوگ اسی شاذ کے اشارے پر غلطی کی تصویب کر دیتے ہیں اور اگر کوئی غلطی عام ہو جائے اور اس کی تائید میں کوئی قول بھی نہ ملے تو اس وقت قواعد سے خروج کر کے غلطی کو پاس کر دیتے ہیں اور اس خروج کا نام انہوں نے «انزیاح» رکھا ہوا ہے" (ص ۳۹۵تا۳۹۷)۔

اہل زبان غیور عرب علماء کی ان تصریحات اور تنبیہات کے ہوتے ہوئے ہم عجم کس طرح ان لغوی اکیڈمیوں اور ان کے متخصصین کو معتبر اور قابل تقلید ٹھہرا سکتے ہیں۔ حاشا و کلا!

**تبصرہ:** کسی قدیم لفظ میں جزوی طور پر کسی معنی کا اضافہ اگر غلط ہے تو بتائیے کہ "ساعۃ" بمعنی گھنٹہ (۶۰ منٹ) کس بنیاد پر درست ہے؟ اور اس لفظ کا یہ معنی قرآن اور حدیث میں یا کسی قدیم معجم میں آیا ہے؟

**تبصرہ بر تبصرہ:** مؤلف نے کب دعوی کیا کہ عربی بالکل جامد و منجمد ہے اور رہے گی، اس میں ذرا بھی اضافہ و توسیع کی گنجائش نہیں؛ بلکہ گنجائش ہے اور رہے گی؛ لیکن یہ اضافہ و توسیع دینی اور لسانی غیرت و حمیت کے حامل اہل زبان عرب علماء کے اتفاق سے ہو اور عربی زبان کے شفاف مزاج و مذاق سے بھی ہم آہنگ ہو تو اس کی درستگی اور اس کی ضرورت میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عباسی دور سے لے کر ۱۲۵۰ھ سے پہلے تک علوم و فنون اور دیگر ابواب میں جو کچھ اضافات و توسیعات وجود پذیر ہوئیں وہ سب اسی قبیل سے ہیں۔

مؤلف تو بس سوز دل کے ساتھ اس بات پر توجہ دلا رہے ہیں کہ مستشرقین اور ان کے چیلے جو اپنی گھناونی سازش کے تحت ان لغوی اکیڈمیوں پر قبضہ کر کے اضافہ و توسیع کے نام پر "عربی زبان کی کھال اتار کر اس کا مثلہ بنانے اور عربی زبان کو فرنگی قالب میں ڈھالنے میں مصروف ہیں" اس پر متنبہ ہونے اور اس کا سدباب کرنے کی ضرورت ہے۔

**چوتھی مثال**: رجال الدین: یہ فرنگی تعبیر ہے، انگریز نے لفظ "علماء "کو سائنس دانوں کے لیے خاص کر دیا اور دینی علماء کو وہ علماء ہی نہیں مانتے اس لیے ان کو "clergy "یعنی "رجال الدین " کہتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی الدین الہلالی نے "تقویم اللسانین "میں لکھا ہے: «ومن العبارات المأخوذة من اللغات الأجنبيه الأوروبيه التعبير عن علماء الدين برجال الدين وهو تعبير ظاهر الفساد» (ص ٤٣٧)

**تبصرہ**: کیا لفظ علماء انگریزی زبان کا لفظ ہے کہ انگریزوں نے علماء کا ایک مفہوم طے کر دیا یا رجال الدین انگریزی زبان کا لفظ ہے؟ اگر نہیں تو یہ انگریزی تعبیر کیسے ہو گئی؟ (جائزہ ص ۱۸)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: محترم تبصرہ نگار یہاں "انگریزی لفظ" اور "انگریزی تعبیر" میں فرق نہیں کر پا رہے جس کی وجہ سے صحرائے خلط و التباس میں سرگرداں ہیں۔ مؤلف کیا، عربی زبان کا ادنی طالب علم بھی جانتا ہے کہ علماء اور رجال الدین انگریزی نہیں عربی الفاظ ہیں۔ نقد اس پر ہے ہی نہیں ؛ بلکہ اصل نقد اس کا مفہوم اور مصداق طے کرنے پر ہے۔

چنانچہ مؤلف صفحہ نمبر ۳۸۲ پر فرماتے ہیں کہ: "فرنگی عربی والوں نے "سائنس" کا ترجمہ "علم" سے اور "سائنسداں" کا ترجمہ "عالم و علماء" سے کر کے اتنا رائج کر دیا کہ گویا یہی اس لفظ کے اصل معنی ہیں اور سائنس اور سائنس داں ہی "علم و علماء" کہلانے کے مستحق ہیں، رہے دینی علم اور علماء تو وہ علم و علماء کہلانے کے مستحق ہی نہیں ہیں چنانچہ آج لفظ "علم، عالم، علماء" سے عربوں کے ذہن میں سائنس اور سائنسدان ہی آتے ہیں جو کہ انتہائی گھٹیا تحریف ہے (ص ۳۸۲)۔

**تبصرہ**: رجال کی اضافت دین کی طرف مرکب اضافی ہے اور یہ عربی اسلوب ہے، جہاں تک معنی کی بات ہے تو عربی میں ادنیٰ مناسبت سے نسبت کی جاتی ہے۔ (جائزہ ص ۱۸)

**تبصرہ بر تبصرہ**: اگر ہر مرکب اضافی عربی اسلوب و تعبیر بن سکتا ہو تو پھر ہم عجمیوں کو بھی حق دیجیے کہ ہم "اساتذہ" کے لیے "رجال الدرس "گھڑ کر رائج کر دیں اور جہاں تک معنی کی بات ہے تو یہاں اساتذہ کی درس سے ادنیٰ نہیں اعلیٰ مناسبت پائی جا رہی ہے۔ پھر کسی عرب یا

مستعرب کو یہ اعتراض کی گنجائش نہ ہو کہ "صاحب! اس سے تو خلط و اشتباہ ہو رہا ہے کہ "سبق والوں" سے مراد "طلبہ" ہیں یا "اساتذہ"؟. اس لیے کہ یہ لفظ تو دونوں ہی کے لیے بولا جاسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی کلمہ کی عربیت و فرنگیت کا مدار صرف اس کے مرکب اضافی ہونے پر رکھ دینا ایسی بچکانہ حرکت ہے جو شاید اول دوم کا طالب علم بھی نہ کرے؛ لہذا نحوی و صرفی قواعد و اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی ترکیب اور قالب پر بھی نظر رکھنا ہو گا کہ کہیں یہ ترکیب یا قالب فرنگی تو نہیں؟ پھر یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اس لفظ کے رواج و شیوع میں کوئی گھناونی فکر تو پنہاں نہیں؟

اگر آپ اس نقطہ نظر سے "رجال الدین" کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی جس کو مؤلف نے صفحہ نمبر ۳۸۲ پر بیان کیا ہے کہ "چونکہ فرنگی عربی والوں نے "علم و علماء" کو "سائنس اور سائنسداں" کے لیے خاص کر دیا؛ اس لیے انہوں نے "دینی علماء" کے لیے لفظ "رجال الدین" کو گھڑ کر رائج کر دیا، گویا دینی علماء کو وہ علماء ہی نہیں سمجھتے بلکہ یہ ان کی نظر میں جہلا ہیں" (ص ۳۸۲)۔

**تبصرہ:** اگر کوئی فرد یا جماعت علماء کو سائنسداں کے لیے خاص کر لے اور رجال الدین کو علمائے دین کے لیے تب ہے اعتراض کی بات اور اسی پر علامہ ہلالی کا نقد ہے جو درست ہے مگر اہل فصحیٰ اس مرض سے پاک ہیں وہ علماء اور رجال الدین دونوں تعبیروں کو علماء کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** آپ نے یہ کہہ کر کہ "اہل فصحیٰ اس مرض سے پاک ہیں" خود یہ تسلیم کر لیا کہ جو عرب اہل فصحیٰ نہیں ہے وہ اہل فرنگ اور مستشرقین کی سازش کا شکار ہو کر سائنس دانوں کے لیے علماء اور علماء کے لیے رجال الدین کے لفظ کو استعمال کرنے کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

پھر آپ نے اہل فصحیٰ کو اس مرض سے پاک بتایا؛ لیکن اس مرض سے پورے طور پر پاک تو وہ بھی نہیں ہے؛ اس لیے کہ آپ ہی کے بقول "وہ علماء اور رجال الدین دونوں تعبیروں کو علماء کے لیے استعمال کرتے ہیں" تو فرنگی تاثر کا آدھا مرض تو لگ چکا ہے کہ وہ فرنگیوں کا رائج کردہ لفظ "رجال

الدین" انہیں کے طے کردہ مفہوم و مصداق علماء کے لیے استعمال کرنے لگے ہیں، تو پھر بقیہ آدھے مرض کے بدن عربی کے اندر سرایت کر جانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا؛ بلکہ بغور جائزہ لیں! ممکن ہے کہ مرض پورا ہی لگ چکا ہو اور ابھی آپ کو خبر بھی نہ ہو۔

**تبصرہ:** پھر علامہ ہلالی نے اس تعبیر کو علماء کے لیے استعمال پر اس لیے ناپسند کیا ہے کہ ان کی رائے ہے کہ یہ تعبیر تو ہر صاحب مذہب کے لیے بولی جا سکتی ہے چاہے علماء ہوں یا نہ ہوں گویا یہ تعبیر اپنے مفہوم میں ناقص ہے ان کی پوری عبارت ملاحظہ ہو:

**«ومن العبارات الماخوذة من اللغات الاجنبية الاوروبية التعبير عن علماء الدين برجال الدين وهو تعبير ظاهر الفساد لان كل من كان له دين يدين به سواء أكان من العلماء بالدين او لم يكن منهم فهو من رجال الدين»**

اب آدمی یہ طے کرلے کہ ہمیں تو آدھی ادھوری عبارت نقل کر کے اپنے مطلب کی بات نکالنی ہے تو پھر بتائیے کہ اسے کیا نام دیا جائے؟ (جائزہ ص ۱۹)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** آدھی ادھوری عبارت نقل کرنا نقص اس وقت ہوتا ہے جب پوری عبارت نقل کرنے سے مدعا کے برخلاف مطلب ثابت ہوتا ہو جبکہ مؤلف کا مدعا ہر دو صورت میں محفوظ ہے؛ بلکہ لطف تو یہ ہے کہ متروکہ عبارت کو بڑھا دینے سے مؤلف کے مدعا اور مطلب میں اور جلا پیدا ہو رہا ہے؛ اس لیے کہ علامہ ہلالی فرما رہے ہیں کہ « رجال الدین » ایسی تعبیر ہے جس کی خرابی عیاں ہیں؛ اس لیے کہ "رجال الدین "یعنی دیندار تو عالم غیر عالم سبھی کو کہا جاتا ہے"۔

معلوم ہوا کہ "دینی علماء کو وہ (یعنی انگریز) علماء ہی نہیں مانتے؛ اس لیے ان کو (دوسرے عام لوگوں کی طرح) رجال الدین کہتے ہیں" (ص ۴۳۷)۔

**پانچویں مثال:** على حساب الضعفاء: یہ فرنگی ترکیب و تعبیر ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم السامرائی نے اپنی کتاب "تعابير أوربية في العربية الحديثة" میں لکھا ہے کہ: «على حساب كذا» عربی اسلوب نہیں ہے؛ بلکہ فرنگی تعبیر ہے اس کو فرنگی تعبیر "Sur le compte" اور

انگریزی تعبیر "at the expense" کے قالب میں ڈھال کر بنایا گیا ہے۔(ص ۴۳۸)

**تبصرہ:** «علی حساب کذا» خالص عربی تعبیر ہے (کیونکہ)... معاصر لغات اور مجامع نے اس معنی کو قبول کیا ہے۔(جائزہ ص ۱۹)

**تبصرہ بر تبصرہ:** محترم تبصرہ نگار دلیل میں جن معاصر لغات اور مجامع کو پیش کر رہے ہیں وہ تو در حقیقت عربی زبان کی سب سے بڑی قتل گاہیں ہیں، چنانچہ مؤلف کتاب نے باضابطہ ایک باب ہی اس کے لیے مختص کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو "چھٹا باب عربی زبان کی تین قتل گاہیں" ان میں سے "پہلی قتل گاہ: صحف و مجلات اور ذرائع ابلاغ" ہیں "دوسری قتل گاہ: مجامع اللغۃ خصوصاً قاہرہ کی مجمع اللغۃ" ہے اور "تیسری قتل گاہ: جدید معاجم اور قوامیس" ہیں۔ مؤلف نے "پہلی قتل گاہ کو "صحف و مجلات کی دجل کاریاں" کے عنوان سے "دوسری قتل گاہ کو مجامع اللغۃ کی کارستانیاں" کے عنوان سے، اور تیسری قتل گاہ کو "جدید معاجم اور قوامیس کی ملمع سازیاں" کے عنوان سے بیان کیا ہے"۔ اور کوئی ایک بات بھی اہل زبان عرب علماء کے حوالے کے بغیر نہیں کہی (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۸۶ تا ۴۱۳)۔ لہذا تبصرہ نگار کی یہ دلیل ساقط الاعتبار ہے۔

**تبصرہ:** اور یہ صرف اخباری لفظ نہیں ہے بلکہ علمی اسلوب اور علمی بحوث میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔(جائزہ ص ۱۹)

**تبصرہ بر تبصرہ:** ڈاکٹر ابراہیم السامرائی نے یہ علت بیان نہیں کی کہ «علی حساب کذا» عربی اسلوب نہیں ہے بلکہ فرنگی تعبیر ہے؛ اس لیے کہ یہ صحافت اور اخباروں میں استعمال ہوتا ہے؛ بلکہ انہوں نے مطلقاً کہا ہے کہ "یہ عربی اسلوب نہیں ہے بلکہ فرنگی تعبیر ہے" اب وہ اخبارات میں استعمال ہو رہی ہو یا علمی بحوث میں، بہر حال عربیت کے مزاج کے ہم رنگ نہیں ہیں۔

**تبصرہ:** مفہوم میں جزوی تحدید نہ کسی اصول کے خلاف ہے اور نہ ہی کسی عربی قاعدے کے۔ اس میں رواج عام و خاص سند ہے۔(جائزہ ص ۲۰)

**تبصرہ بر تبصرہ:** رواج خاص سے اگر یہ مراد ہے کہ وہ خواص عرب علماء جو زبان کے

مفردات وتراکیب، اسالیب وتعبیرات اور اس کے مزاج و مذاق سے بخوبی واقف ہیں۔ زبان کے تئیں غیور ہیں اور عربی زبان کی دینی حیثیت کو بھی جانتے اور سمجھتے ہیں، تب تو واقعی ایسا رواج خاص سند ہے اور رہے گا جس پر مؤلف کو بھی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں رواج خاص میں کسی فرنگی تعبیر و اسلوب کو رواج پانے تو کیا دم مارنے کے بھی ہمت نہ ہوگی؛ لیکن اگر مراد رواج خاص سے ایسے صحافی، ادباء، نثر نگار، مضمون نگار اور مجامع وغیرہ کے ارکان ہوں جو نہ تو عالم ہوں، نہ ہی عربی زبان کی دینی حیثیت سے واقف ہوں اور نہ ہی اس زبان کے تئیں غیرت رکھتے ہوں؛ بلکہ فرنگ و فرنچ کے دلدادہ اور رسیا ہوں۔ تو آپ یہ بتائیں کہ ایسے خواص کے رواج پر جب اخص الخواص عرب علماء تنبیہ کردیں تو ہم عجمی حضرات کے لیے کیا ایسے رواج خاص کو سند بنانے کی گنجائش ہوگی؟

**تبصرہ**: لیکن افسوس ہے کہ احمد الغامدی کا لفظ "العرنجية" نہ تو عربی لفظ ہے اور نہ ہی اس کو کسی اکیڈمی نے پاس کیا اور نہ ہی اسے شیوع حاصل ہوا؛ مگر ہمارے مصنف محترم اور ان کے ہم نوا حضرات اس لفظ کو در نایاب سمجھ کر اس پر لٹو ہوئے جارہے ہیں۔ (جائزہ ص ۲۰)

**تبصرہ بر تبصرہ**: " العرنجية" ایک کتاب کا نام ہے۔ مصنف کتاب ترجمان احمد الغامدی صاحب نے اس کو عربی کے "عر" اور "افرنجيه" کے "نجيه" کو ملا کر ایک لفظ "العرنجيه" بنایا ہے، صرف یہ پیغام دینے کے لیے کہ جدید عربی کا حال بھی کچھ ایسا ہی "آدھا تیتر آدھا بٹیر" کا مصداق ہے کہ اس کو نہ تو پورے طور پر عربی ہی کہہ سکتے ہیں اور نہ پورے طور پر فرنگی؛ بلکہ یہ «منزلة بين المنزلتين» ہے جس کی صحیح ترجمانی لفظ "عرنگی" ہی کر سکتا ہے یعنی "عربی حروف میں فرنگی زبان"۔

نہ تو مصنف الغامدی صاحب اس لفظ کی عربیت کے مدعی ہیں اور نہ ہی مؤلف اس کے دلائل کے درپے ہیں اور نہ ہی ان کے مؤیدین کو کچھ خلط و التباس ہے۔ لٹو ہونا صرف اس معنی خیزی اور باریک نکتہ پر ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کردیا ہے۔

**چھٹی مثال**: ولم يكدح ساعة لصالحه: یہ لغوی غلطی ہے، متعدّد عرب علماء نے لکھا

ہے کہ "صالح" کے اندر مصدری معنی نہیں ہے؛ اس لیے «هو يعمل لصالح كذا» کہنا لغتاً غلط ہے، ہاں اس مفہوم میں «هو يعمل لمصلحة كذا» کہہ سکتے ہیں۔

**تبصرہ:** «لصالح فلان یا لصالح كذا» کی تعبیر نے رواج عام حاصل کیا ہے نہ یہ فرنگی تعبیر ہے اور نہ ہی غلط دو سو سالوں سے علماء و ادبا اسے استعمال کر رہے ہیں۔ (جائزہ ص ۲۰)

**تبصرہ بر تبصرہ:** محترم تبصرہ نگار جگہ جگہ بقول شخصے "اصول مناظرہ" کی یہ غلطی کر رہے ہیں کہ "ایک فریق نے جس دلیل کو دلائل سے ساقط الاعتبار ثابت کر دیا خصم اسی دلیل کو دائرۂ اعتبار میں لاکر گفتگو کر رہا ہے"۔

محترم تبصرہ نگار یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ دو سو سالوں سے علماء اور ادباء اسے استعمال کر رہے ہیں جب مفاد اور مصلحت کا معنی و مفہوم پرانا ہے تو اس کی عربی اور اس کا استعمال بھی ڈیڑھ دو ہزار سال پرانا ہونا چاہیے۔

معلوم ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور وہ یہ ہے کہ «لمصلحة كذا» کی جگہ «لصالح كذا» کی تعبیر صرف دو سو سال پرانی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب دشمنان عربیت کی سوچی سمجھی سازش کے تحت عربی زبان کو "فرنگی عربی" بنانے کی مہم شروع ہو چکی تھی جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ:

"جب محمد علی پاشا مصر کا حاکم بنا تو اس نے مصر کو یورپین رنگ سے رنگنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے اپنے دور حکومت میں تقریباً ۱۲۴۰ ہجری میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے مصری طلبہ کو یورپین ممالک اور بالخصوص فرانس کی طرف بھیجنا شروع کیا اور سینکڑوں طلباء کو کئی سالوں میں اور مختلف کھیپوں میں بھیجا۔ یہ طلبہ فرانس اور دیگر یورپین ممالک میں جاکر فرنگیوں سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے اور وہاں کے مخلوط ماحول میں دین و قید سے بے لگام ہو کر فرنگی رنگ میں پوری طرح رنگ جاتے تھے...

"یہ طلبہ فرنگی زبان میں پختہ ہوتے؛ مگر اپنی عربی زبان میں سطحی اور کمزور ہوتے تھے پھر یہی طلبہ مصر کے اداروں میں اساتذہ بنتے اور فرنگی علوم و فنون کو اور تہذیب و عریانیت کو سرزمین مصر میں

پھیلاتے تھے اور مصری بچوں اور بچیوں میں منتقل کرتے تھے۔ پھر انہی لوگوں کے ذریعے بعد میں پورے مصر میں فرنگیت کا غلغلہ مچ گیا اور ہر مصری بچے اور بچی پر فرنگی چھاپ پڑگئی"۔

"مذکورہ بالا مبعوث طلباء میں سرفہرست "رفاعہ رافع طہطاوی" کا نام ہے جو ۱۲۴۶ ہجری میں فرانس سے فرنگی ذہنیت لے کر مصر واپس آیا پھر اس نے ایک ٹیم بنا کر فرنگی علوم وفنون کا ترجمہ کرنے کی مہم شروع کی اور یہیں سے عربی زبان کو "فرنگی عربی" بنانے کی مہم شروع ہوگئی؛ کیونکہ رفاعہ رافع طہطاوی کی اس ٹیم کے تمام افراد فرانسیسی زبان میں ماہر اور عربی زبان میں انتہائی سطحی تھے اور فرنچ کی تقلید کو عربی پر ترجیح دیتے تھے؛ اس لیے یہ لوگ قصداً فرنگی جملوں کو بعینہ عربی حروف میں ادا کر کے تحت اللفظ ترجمہ کرتے تھے، یعنی فرنگی زبان کے ہر جملے کو ہو بہو فرنگی ساخت میں باقی رکھ کر صرف اتنا کرتے تھے کہ ہر فرنگی لفظ کو حذف کر کے اس کی جگہ عربی لفظ رکھ دیتے تھے۔ جملے کی ترتیب وہی فرنگی ترتیب، جملے کا قالب وہی فرنگی قالب، جملے کی ساخت وہی فرنگی ساخت، لب ولہجہ وہی فرنگی لب ولہجہ ہوتا تھا، صرف اس کے حروف ومفردات عربی کے ہوتے تھے"۔

"اس وقت عصری علوم میں مصر پورے عالم عرب کا قبلہ اور مرجع تھا، تمام بلاد عرب مصر کے مقلد تھے؛ اس لیے مصر نے تمام بلاد عرب میں مذکورہ مترجم کتابوں کو خوب عام کیا اور پورے عالم عرب میں اس فرنگی عربی کی وبا پھیلا دی۔ یعنی اولاً مصریوں نے عربی زبان کو فرنچ کے قالب میں ڈھال کر اس کو مسخ کیا۔ پھر پورے عالم عرب نے مصریوں سے اس مسخ شدہ زبان کو اخذ کیا"۔

"پھر رفتہ رفتہ عربوں نے فرنچ کی تراکیب اور لب ولہجوں کے ساتھ بے شمار انگلش کی تراکیب اور لب ولہجے بھی اس مخلوط زبان میں شامل کر دیے جس سے زبان "کریلا اور نیم چڑھا" کا مصداق بن گئی، اور عربی زبان سے مزید دور ہوگئی۔ پھر عالم عرب میں اسی فرنگی عربی میں خامہ فرسائی کا طوفان برپا ہوا۔ تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف، خطوط نویسی اور کالم نگاری؛ سب کچھ اسی میں کیا گیا غرضیکہ ۱۲۵۰ ہجری کے بعد اسی فرنگی عربی میں لکھنے پڑھنے کے تمام فرائض انجام دیے گئے اور عربوں کا مزاج ومذاق انگریزی وفرنگی بن گیا اس طرح عربی زبان بالکلیہ فنا ہو کر فرنگی زبان بن گئی جس میں

صرف عربی زبان کے حروف وقشور بوسیدہ کھنڈرات کی طرح باقی رہ گئے۔

شیخ ترجمان احمد الغامدی «العرنجیۃ» میں لکھتے ہیں: «أحسبه يقفك ان شاء الله على حقيقة الامر ويرفع عنك الشبهة حتى تعلم ان الخلاف ما هو في الفاظ وتراكيب قليلة دخلت العربية من كلام العجم وانما هو في ان العربية كلها تبدلت» (یعنی: میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیان آپ کو حقیقت حال سے واقف کردے گا اور آپ کا شبہ دور کردے گا تو آپ یہ حقیقت جان لیں گے کہ اختلاف اس میں نہیں ہے کہ عجمی زبان کے کچھ الفاظ اور ترکیبیں عربی زبان میں داخل ہو گئی ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ پوری عربی زبان ہی بدل چکی ہے) (کتاب مؤلف ص ۱۳۲ تا ۱۳۹)۔

الغرض خود غیور اہل زبان عرب علماء کے نزدیک حالیہ دو سو سال کا عرصہ تعبیرات کی حجیت کے باب میں ساقط الاعتبار ہے؛ لہذا کسی لفظ کی عربیت وفرنگیت کے باب میں اس زمانہ کا حوالہ دینا بھی ناقابل اعتبار ہو گا۔

**شبہ:** اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ تعبیرات کی فرنگیت پر تنبیہ کرنے والے مصنفین بھی حالیہ دو سو سال کے ہیں تو پھر لفظ وتعبیر کی فرنگیت کے باب میں ان کا قول بھی معتبر نہ ہونا چاہیے؟

جواب: تو اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی معتبر نہ ہوتا اگر بنیاد صرف ان کا کہنا ہوتا؛ لیکن یہاں تو وہ اپنی کہی ہوئی باتوں پر قدیم عربی اور اس کے قدیم مآخذ سے دلائل بھی فراہم کر رہے ہیں تو ان کی بات ماننا دراصل قدیم مآخذ کو ماننا ہوا، نہ کہ خود ان کو۔

**تبصرہ:** معجم الصواب اللغوی کے مؤلف نے پہلے اکثر ادباء کی رائے لکھنے کے بعد اپنی رائے دی ہے کہ "مصلحت" اس معنی میں فصیح ہے؛ لیکن "صالح" مقبول ہے۔ (جائزہ ص ۲۱)

**تبصرہ بر تبصرہ:** معجم الصواب اللغوی کے مؤلف نے اس تعبیر کے تعلق سے اکثر ادباء کی جو رائے لکھی وہ یہ ہے کہ «مرفوضة عند الاكثرين لانها لم ترد في المعاجم بهذا المعنى» آپ بتائیں کہ ایک طرف تو اکثر ادباء اس تعبیر کو متروک اور رد کر رہے ہیں؛ کیونکہ یہ تعبیر معاجم میں اس معنی میں آئی ہی نہیں، تو پھر آپ معدودے چند ادباء کے استعمال پر اس کی تصویب

کیسے کر سکتے ہیں؟

حالانکہ تمام علوم و فنون کے ابواب میں اعتبار جمہور کا ہوتا ہے، نہ کہ تفرد و شذوذ اختیار کرنے والوں کا؛ بلکہ کہنے دیجئے کہ یہ تو وہی مستشرقین کی سازش معلوم ہوتی ہے جس کو مؤلف نے "فصیح کا خاتمہ اور شاذ و غلط کی ترویج" کے عنوان سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

"عربی میں ایک لفظ پہلے فصیح اور رائج تھا۔ مثلاً ۹۸ فیصد استعمال ہوتا تھا۔ اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے جو پہلے عربی میں غیر فصیح یا شاذ تھا۔ مثلاً ۲ فیصد استعمال ہوتا تھا۔ پھر عہدِ ترجمہ میں جب فرنگی علوم و فنون کا لفظی ترجمہ کیا گیا تو پہلا لفظ یعنی جو ۹۸ فیصد مستعمل تھا فرنگی زبان کے قالب پر فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا اور دوسرا لفظ جو ۲ فیصد مستعمل تھا فرنگی زبان کے قالب پر فٹ ہو رہا تھا؛ اس لیے جدید عربی میں پہلا لفظ ترک کر دیا گیا اور دوسرا لفظ رائج کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں آج جدید عربی میں ۹۸ فیصد والا لفظ ۲ فیصد والا بن گیا اور ۲ فیصد والا لفظ ۹۸ فیصد والا بن گیا۔ (کتاب مؤلف ص۲۵۵)

**تبصرہ**: اسی کتاب میں جو بات آپ کے موافق ہوتی ہے اس میں یہ کتاب مستند حوالہ ہوتی ہے اور جو بات آپ کی رائے کے خلاف ہوتی ہے وہ غلط کیسے ہو جاتی ہے؟ (جائزہ ص۲۱)

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ یہ تو بیان کرنے کی زحمت کرتے کہ مؤلف نے کس سیاق و تناظر میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے اس سیاق و تناظر کو سامنے رکھے بغیر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ مؤلف کے نزدیک اس کتاب اور اس کے مؤلف کی استنادی حیثیت کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ مؤلف کے نزدیک یہ کتاب اصلاً تو غیر مستند اور ناقابل اعتبار ہو؛ لیکن کہیں تبعاً و ضمناً، یا تائیداً یا الزاماً انہوں نے اس کتاب کا حوالہ دے کر «خذ ما صفا و دع ما كدر» پر عمل کر لیا ہو۔

**ساتویں مثال**: فكان لابد من عمليه جراحيه: انگریزی کے لفظ "operation" کا ترجمہ «عملية جراحية» سے کیا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی نے "تقویم اللسانین" میں لکھا ہے: «ومن المصائب التي جاء بها الاستعمار الأجنبي "العملية" واستعمالها

يخدش وجه اللغة العربية ويشينها فان كان لابد فليقل علاج جراحي أو عمل جراحي»۔ (کتاب مؤلف ص ۴۳۸)

**تبصرہ**: مصدر سے پہلے «عملية» کلام کو بوجھل کرتا ہے بہتر ہے کہ مصدر ہی کو استعمال کیا جائے اتنی سی بات میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر «عملية» کو لانا ہی ہو تو «عمل » کہو۔ (جائزہ ص ۲۱)

**تبصرہ بر تبصرہ**: عربی مزاج و مذاق سے آشنا عرب عالم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی تو یہ کہہ رہے ہیں: «و استعمالها يخدش وجه اللغة العربية ويشينها » (کہ اس کا استعمال عربی زبان کے چہرے کو نوچ گھسوٹ کر اسے عیب دار بنا دیتا ہے) اور آپ عجمی ہو کر فرما رہے ہیں کہ مسئلہ صرف ثقل وخفت کا ہے "اتنی سی بات میں کوئی حرج نہیں"۔ عربی کا طالب علم آپ کی بات کو مانے یا عربی مزاج و مذاق سے آشنا عرب عالم کی؟

باقی اگر شیخ نے «عملية» کی جگہ «عمل» کی گنجائش رکھی ہے تو اس لفظ کے عربی مذاق سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے رکھی ہے۔ اس کا بالکل بھی یہ مطلب نکالا نہیں جا سکتا کہ جب «عمل » بڑھانے کی گنجائش ہے تو لاؤ «عملية» ہی بڑھالیں۔

**تبصرہ**: اب اسی لفظ کے بارے میں معجم الصواب اللغوی کا فیصلہ سنیے: « أجريت له عملية جراحية فصيحة»۔ (ج ۲۱)

**تبصرہ بر تبصرہ**: معجم الصواب اللغوی کے بارے میں پانچویں مثال پر تبصرہ کے ذیل میں ص ۲۰ پر آپ کا خود تبصرہ ہے کہ "مستعمل غلط کلمات کی اصلاح کے لیے لکھی گئی ہے" تو آپ نے یہ کہہ کر کہ "مستعمل غلط کلمات کی اصلاح کے لکھی گئی ہے" خود ہی تسلیم کر لیا کہ اس کتاب میں مذکور کلمات چاہے وہ » انسحب» ہو، یا «لصالح كذا » ہو یا «عملية» ہو سب مستعمل غلط کلمات ہیں؛ لہذا جب آپ نے کلمات کو غلط تسلیم کر ہی لیا تو پھر آگے ہمیں مزید رد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

**آٹھویں مثال**: » أعضاء الأسرة » یہ دونوں فرنگی تعبیر ہیں۔ عربی میں "اہل خانہ" کو «أهله، أهل بيته» وغیرہ کہتے ہیں۔ جدید عربی والوں نے "family" کا ترجمہ «عائلة، أُسرة» سے کیا اور "family members" کا لفظی ترجمہ «أعضاء الأسرة» سے کر دیا جو کہ غلط ہے۔ حضرت علی میاں صاحب کے استاذ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی "تقویم اللسانین" میں لکھتے ہیں: «ومن ذلك تعبيرهم عن أهل البيت الواحد بالأسرة وهو من استعمال جهلة المترجمين ترجموا به لفظ "family" الانكليزي وكانوا يترجمون هذا اللفظ من قبل بعائلة فعاب ذلك عليهم النقاد لان العائلة في العربية هي المرأة الفقيرة فانتقلوا الى ترجمته بأسرة وهو انتقال من خطأ الى خطأ آخر»۔ (کتاب مؤلف ص ٤٣٩)

**تبصرہ**: مصنف نے اس پوری عبارت میں «أسرة» کا معنی نہیں لکھا۔ (ج ۲۲)

**تبصرہ بر تبصرہ**: مؤلف چونکہ اس لفظ پر ماقبل میں صفحہ ۱۸۴ پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں؛ اس لیے انہوں نے یہاں یعنی صفحہ ۴۳۹ پر اختصار سے کام لیتے ہوئے ترجمہ کو حذف کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۸۴ کی یہ عبارت: "کیونکہ «أسرة» کے معنی ہیں: قبیلہ اور قریبی رشتہ دار"۔

**تبصرہ**: ... اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ انگریزی لفظ ہے حالانکہ خالص عربی لفظ ہے۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: بحث اس سے نہیں کہ لفظ عربی ہے یا انگریزی؟ بحث تو اسلوب و ترکیب اور قالب وسانچہ کی ہے کہ یہ فرنگی ہے یا عربی؟

اور «أعضاء الأسرة» میں مؤلف کا یہ نقد بالکل واضح ہے کہ "یہ فرنگی لفظ « family members » کے قالب اور سانچے کے موافق ڈھالا گیا ہے اور بالکل تحت اللفظ ترجمہ ہے" اس اصل نقد پر آپ کا تبصرہ ندارد ہے۔

**تبصرہ**: ... پہلے اس کا دائرہ بڑا تھا۔ قبیلہ اور خاندان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ آج کے استعمال میں اس کے معنی میں جزوی تحدید ہوئی اور یہ لفظ عام ہو گیا۔ تو یہ کون سی غلط بات ہو گئی؟ وقت کے حساب سے جزوی تحدیدات ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ لغت میں نحو،

صرف، بلاغت، فقہ، حدیث، تفسیر، منطق کے مفاہیم کیا ہیں؟ اور کس وجہ سے ان کے مفاہیم کی جزوی تبدیلیوں کو قبول کیا گیا؟ جب کہ وہ عرف خاص ہیں تو عرف عام کی وجہ سے کسی لفظ کی جزوی تحدید ہوگئی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ گیا؟۔ (ص۲۲)

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ کسی معنی میں جزوی تحدید کی درستگی کے اس لیے قائل ہیں؛ کیونکہ مختلف دینی علوم میں جو اصطلاحات وضع کی گئی ہیں وہ بھی تو آخر جزوی تحدیدات ہیں تو اگر عرف خاص جزوی تحدید کر سکتا ہے تو عرف عام کیوں نہیں؟ محترما! کیا ہر عرف عام معتبر ہے؟ یا اس کی کچھ حدود وقیود بھی ہیں؟ جس طرح شریعت کے باب میں عرف کی دو قسمیں ہیں: ا۔ عرف صحیح اور ۲۔ عرف فاسد۔

اور عرف فاسد وہ ہے جو نصوص سے متصادم ہو۔ اسی طرح لسان وادب کے باب میں بھی عرف کی دو قسمیں ہیں: ا۔ عرف صحیح اور ۲۔ عرف فاسد۔ اور عرف فاسد وہ ہے جو اس خاص زبان کے خاص مزاج ومذاق سے ہٹ کر ہو۔

اور جس طرح شریعت کے باب میں عرف فاسد کی تعیین فقہاء کرام کرتے ہیں۔ اسی طرح لسان و ادب کے باب میں عرف فاسد کی تعیین اس زبان کے غیور ماہرین فن اور نقاد کرتے ہیں۔ جن کی تعیین اور نقد کے بعد اس عرف فاسد کا بالکل بھی اعتبار نہیں رہ جاتا۔

اور مؤلف عرب عالم علامہ ہلالی کا نقد «وهو من استعمال جهلة المترجمين» اور «وهو انتقال من خطأ الى خطأ آخر» نقل کر دیا ہے۔ تو جن جاہل مترجمین کے استعمال کردہ لفظ سے غیور اہل زبان عرب علماء کو اِباء واستنکاف ہو اور وہ اسے غلطی اور خطا قرار دیتے ہوں تو ایسے لفظ کا معروف ہوجانا عرف عام صحیح میں معنی جائے گا یا عرف عام فاسد میں؟

اور اگر عرف عام فاسد بھی ایسا ہی معتبر ہے تو پھر تو کسی کو انگریزی مفردات «باص، تاكسي، باس بورت، الكاميرا، اور لاب توب» وغیرہ پر بھی چیں بجبیں نہ ہونا چاہیے؛ حالانکہ مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ نے «متى تكون الكتابات مؤثرة» میں اس پر زبردست نقد

کیا ہے۔

**تبصرہ**: لفظ کے شروع سے قبل مترجمین نے اس کو جب استعمال کیا تو اس پر نقد کی گنجائش بھی تھی؛ لیکن لفظ کے عام ہو جانے کے بعد اس خالص عربی اور فصیح لفظ کا شیوع غلط کیسے ہو گیا؟ (ص ۲۲)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: اسی گنجائش کے پیش نظر علامہ ہلالی اور دیگر عرب علماء نے اس استعمال پر نقد کیا ہے اور اسے جاہلوں کا ترجمہ اور خطا اور غلط قرار دیا ہے؛ لیکن کیا ایسا غلط لفظ عام ہو جانے کے بعد خود بخود خالص عربی اور فصیح لفظ ہو جائے گا؟

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے میر!

اگر بات ایسی ہی ہے تو پھر تو «حافلة» کی جگہ «باص» بھی عام ہو چکا ہے۔ «سيارة أجرة» کی جگہ «تاكسي» بھی عام ہو چکا ہے۔ «جواز السفر» کی ج گہ «باس بورت» بھی عام ہو چکا ہے۔ کیا یہ سارے فرنگی مفردات محض شیوع اور عموم سے خالص عربی اور فصیح ہو جائیں گے؟

اگر آپ یہ کہیں کہ ہماری مراد رواج عام نہیں رواج خاص ہے تو خواص کے بارے میں ہم نے بتا ہی دیا کہ علامہ ہلالی جیسے عرب علماء اس کو خطا اور غلط مانتے ہیں۔

**تبصرہ**: مجمع بحار الانوار میں ہے: «الأُسَرةُ: عشيرة الرجل و أهل بيته»۔ تو اب بتائیے کہ اہل بیت کے لیے «أُسرة» کا استعمال کیسے غلط ہو گیا؟ (ص ۲۲)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: اس کتاب کی استنادی حیثیت میں ہمیں کوئی کلام نہیں؛ لیکن یہ اصول بہر حال پیش نظر رہنا چاہیے کہ "زبان و ادب کے باب میں اہل زبان کا قول اور ان کی شرح غیر اہل زبان کے مقابلے میں کہیں زیادہ وزن اور فوقیت رکھتا ہے" اور ہم نے حوالہ ماہر اہل زبان عرب علماء کا دیا ہے۔

اور پھر علامہ پٹنی رحمۃ اللہ علیہ اس لفظ کی شرح کر رہے ہیں اور کسی لفظ کی شرح اور وضاحت میں توسع ہوتا ہے کہ اس کے مترادفات اور ہم معنی الفاظ کو بھی ذکر کر دیا جاتا ہے جو در حقیقت اس کے

حقیقی معنی نہیں ہوتے بلکہ مجازاً معنوی قربت ہونے کی وجہ سے ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔

پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایسا نہیں ہے کہ عربی والے دلیل میں کچھ بھی پیش نہیں کرتے۔ پیش کرتے ہیں؛ لیکن فرنگی عربی والوں کا دلائل کے باب میں طرز وہ ہوتا ہے جس کو مؤلف نے "فصیح کا خاتمہ اور شاذ و غلط کی ترویج" کے عنوان سے بیان کیا ہے کہ: "اگر ۹۹ دلیلیں یہ کہیں کہ یہ غلط ہے اور ایک شاذ قول سے اشارہ مل جائے کہ یہ جائز ہے تو یہ لوگ اسی شاذ کے اشارے پر غلطی کی تصویب کر دیتے ہیں" (ص ۳۹۷)۔

**نویں مثال:** مما یأسف له الانسان۔ یہ صلہ کی غلطی ہے عربی میں فعل "أسف" حرف «علی» کے ساتھ آتا ہے۔ نہ کہ لام کے ساتھ۔ شیخ اسعد خلیل داغر اپنی کتاب "تذکرة الکاتب" میں لکھتے ہیں: «**یقولون هذا مما یؤسف له فیعدون الفعل أسف باللام ولم یسمع تعدیته عن العرب بـعَلَی فالصواب إذا أن یقال هذا مما یؤسف علیه**» (ص ۴۳۹)۔

**تبصرہ:** تبصرہ نگار نے "أسف" کا صلہ لام ہے اس کے لیے اولاً معجم الصواب اللغوی کی عبارت پیش کی۔ (ج ۲۳)

**تبصرہ بر تبصرہ:** معجم الصواب اللغوی کوئی مستند اور معتبر مآخذ نہیں ہے؛ کیونکہ خود تبصرہ نگار کے بقول "مستعمل غلط کلمات کی اصلاح کے لیے لکھی گئی ہے" اور یہ بات واقع اور نفس الأمری میں صحیح بھی ہے چنانچہ اس معجم کے مؤلف نے اپنے مقدمہ میں خود اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے مستعمل غلط کلمات کی تصویب (جس کو در حقیقت تاویل کہنا چاہیے) کے لیے کتاب لکھی ہے؛ لہذا اس کا حوالہ تو نا قابل اعتبار ٹھہرا۔

**تبصرہ:** تبصرہ نگار نے "أسف" کا صلہ لام ہے اس کے لیے عصر عباسی کے دو شاعر "بحتری" اور "ابو العلی المعری" کا شعر پیش کیا (۲۴)

**تبصرہ بر تبصرہ:** مؤلف کتاب صفحہ ۸۰ پر سعید افغانی کی «**الموجز في قواعد اللغة العربیة**» اور اس کے علاوہ مزید چھ عربی کتب و مقالات کے حوالے سے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ: "جس زمانے کی عربی زبان حجت ہے اس زمانے کو عصر احتجاج کہتے ہیں۔ یہ زمانہ جاہلیت، صدر

اسلام، اور عہد بنو امیہ پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا زمانے جاہلیت ہے اور انتہا عرب امصار میں دوسری صدی ہجری کا نصف (۱۵۰ ہجری) اور عرب بوادی میں چوتھی صدی ہجری کا نصف (۳۵۰ ہجری) ہے"۔

زمانے کی یہ حد بندی نثر کی حجیت کے تعلق سے ہے۔ رہی اشعار کے تعلق سے حد بندی تو "علماء کرام نے شعراء کو چار طبقات میں منقسم کیا ہے: (۱) شعرائے جاہلین۔ (۲) شعرائے مخضرمین۔ (۳) شعرائے اسلامیین۔ (۴) شعرائے محدثین۔ پس اول دونوں طبقوں کا کلام بالاتفاق حجت ہے اور ابراہیم بن ہرمہ (متوفی ۱۵۰ ہجری) وہ آخری مخضرمی شاعر ہے جس کا کلام نحو و صرف کی قواعد سازی میں حجت ہے۔ تیسرے طبقے کے کلام کی حجیت میں علماء کا اختلاف ہے اور چوتھے طبقے کا کلام نحو و صرف میں بالاتفاق حجت نہیں ہے۔ اور بشار بن بُرد (متوفی ۱۶۸ ہجری) وہ پہلا محدَث شاعر ہے جس کا کلام حجت نہیں ہے۔ (صفحہ ۸۱)۔

تبصرہ نگار سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ آپ ایک بڑے ادارے کے استاذ اور عربی مجلہ کے نائب مدیر ہیں؛ لہٰذا استدلال و استشہاد میں جب اشعار کو پیش کر رہے ہیں تو عصر احتجاج اور زمانہ استدلال کا تو لحاظ کریں کہ پیش کردہ شعراء کس عصر اور کس زمانے کے ہیں۔ عصر عباسی کے یہ شعراء "ابو العلی المعری (م ۴۴۹ھ) اور البحتری (م ۲۸۰ھ) ان شعرائے محدثین میں سے ہیں جن کا زمانہ ۱۶۸ ہجری سے کچھ پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے جو شعرائے محدثین کا زمانہ ہے اور شعرائے محدثین چوتھے طبقے کے لوگ ہیں جن کا کلام نحو و صرف میں بالاتفاق حجت نہیں ہے۔ (کتاب مؤلف ص ۸۱)

**تبصرہ**: حیرت یہ ہے کہ "تذکرۃ الکاتب" کے مؤلف یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ لفظ لام کے صلے کے ساتھ بہت زیادہ مستعمل ہے لیکن پھر رائے دیتے ہیں کہ «علی» کا استعمال سنا گیا ہے۔ ہمارے مؤلف محترم کثرت استعمال والی بات حذف کر جاتے ہیں۔ تذکرۃ الکاتب کی پوری عبارت ملاحظہ ہو: «ويقولون: هذا مما يؤسف له وهو شائع كل الشيوع فيما يكتبه كثيرون فيعدون الفعل أسف باللام ولم يسمع تعديته عن العرب الا بـعَلَى فالصواب إذا أن يقال

هذا مما يؤسف عليه» (جائزہ ص ۲۲)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: یہاں مؤلف سے جو عبارت چھوٹ گئی یعنی «وھو شائع کل الشیوع فیما یکتبه کثیرون» اس سے مؤلف کے اصل مدعا پر بالکل بھی زد نہیں پڑتی اس لیے انہوں نے نقل کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی؛ کیوں کہ مؤلف اس بات کے مدعی ہیں ہی نہیں کہ فرنگی عربی وہ ہے جس کا شیوع نہ ہوا ہو؛ بلکہ مؤلف بالواسطہ اور علماء عرب براہ راست اسی کا رونا تو رو رہے ہیں کہ اسلام دشمن مستشرقین خبیثوں نے اپنی ناپاک اور گھناونی سازش کے ذریعے پورے عالم عرب میں فرنگی عربی کو عام اور شائع کر دیا ہے۔

اگر یہ عموم و شیوع ایسا ہی قابل استدلال ہوتا تو خود "تذکرۃ الکاتب" کے مؤلف کو یہ لکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی: «فالصواب إذا أن یقال هذا مما یؤسف علیه» آپ الفاظ پر غور تو فرمائیں کہ تذکرۃ الکاتب کے مؤلف نے «فالأصح یا الفصحی» نہیں کہا۔ اگر وہ یہ کہتے تب تو مقابل میں گنجائش صحیح اور فصیح کی نکل سکتی تھی لیکن یہ نہیں کہا؛ بلکہ انہوں نے «فالصواب» کہا ہے جس کے مقابل کو خطا اور غلط ہی کہا جائے گا۔

**تبصرہ**: یہ ہے مفکر اسلام کی کتاب «ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین» کے دو صفحات کی آٹھ مثالیں جنہیں مؤلف محترم نے پوری دیدہ دلیری اور جسارت کے ساتھ "غلط"، "فرنگی تعبیر"، "عرنگی تعبیر"، "لغوی غلطی" اور "لغوی تحریف" جیسے الفاظ سے نوازا ہے۔ ہم نے تبصرے میں ثابت کر دیا کہ ان میں سے کوئی تعبیر شاذ اور غریب بھی نہیں ہے۔ غلط ہونا تو دور کی بات ہے۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: جی ہاں محترم: اور ہم نے اپنے تبصرے بر تبصرے میں یہ ثابت کر دیا کہ مؤلف کے دعاوی ہنوز برقرار ہیں آپ اپنے تبصروں پر نظر ثانی فرمائیں اور پورے انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنا رجوع شائع فرمائیں۔

وما علینا إلا البلاغ

# لوٹ پیچھے کی طرف...

مثالوں پر تبصرے کے بعد اب ہم نوری جائزہ کے شروع صفحات کے جائزہ کی طرف لوٹتے ہیں اور اب حضرت مولانا نوری صاحب کے لیے عنوان ہوگا "تبصرہ نگار" اور بندہ کے لیے "راقم"۔

**تبصرہ نگار:** پوری کتاب در حقیقت اسی مفروضے پر قائم ہے کہ جدید عربی انگریزوں کی سازش ہے اور خالص عربی زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں .... اور اسی مفروضے کے سہارے...الخ۔ (ص ۲)

**راقم:** مفروضہ کہتے ہیں دعوی بلا دلیل کو اور جو دعوی دلائل سے آراستہ ہو جائے وہ مفروضہ نہیں رہ جاتا؛ بلکہ حقیقت مسلمہ کا رتبہ پا لیتا ہے۔ محترم تبصرہ نگار کا مؤلف کی کتاب کے ہر پیرایہ پر عربی کتب کے حوالہ جات اور جگہ جگہ عربوں کے فراہم کردہ دلائل ملاحظہ فرما لینے کے بعد بھی اس کو مفروضہ قرار دینا انتہائی حیرت کا باعث ہے؛ بلکہ ہوشیار! کہیں دشمن اسے آپ کے تعصب پر محمول نہ کرلیں۔

**تبصرہ نگار:** اس کتاب کی اصل عمارت دمام کے ایک شیخ احمد الغامدی کی کتاب "العرنجیہ" پر کھڑی ہے۔ شیخ احمد الغامدی جیسے حضرات پر مجھے ذرا بھی تعجب نہیں؛ کیونکہ جو تقلید نہیں کرسکتے، وہ تخلیق نہیں کرسکتے۔ (جائزہ ص ۴)

**راقم:** جی بالکل! ہم بھی یہی کہتے ہیں جو فرنگیوں کی تقلید نہیں کرسکتے وہ فرنگی عربی کی تخلیق نہیں کرسکتے۔

**تبصرہ نگار:** فکری میدان ہو، یا ادبی، یا فقہی ہر میدان میں ان (یعنی شیخ احمد الغامدی) کی بے بضاعتی معروف ہے اور وجہ وہی ان کا طرز فکر و عمل ہے۔ (۴)

**راقم:** شیخ کا فکری و فقہی میدان تو کتاب کا موضوعِ بحث ہے ہی نہیں۔ رہا ادبی میدان اور اس میں ان کی بے بضاعتی کا معروف ہونا تو اس شہرت پر کچھ عرب علماء کے شواہد اور دلائل تو پیش

فرمائیں؛ تاکہ ہم جیسے وہمی لوگوں کے لیے تسکین صدور کا باعث بن سکے۔ اور اگر آپ کے یہاں شیخ کی بے بضاعتی کی دلیل ان کا طرز فکر و عمل یعنی عدم تقلید ہے تو کس کی عدم تقلید؟ کیا قدیم عربی کے ادباء کی عدم تقلید؟ یا جدید عربی کے ادباء کی عدم تقلید؟ اول کے تو شیخ پورے مقلد اور انہی کے وکیل صفائی ہیں۔ اور ثانی کی تقلید کی صورت میں ان کی بچی کھچی عربیت بھی رخصت ہو جائے گی۔

**تبصرہ نگار:** جدید عربی... سے مراد "عربی زبان کا دور جدید" ہے۔ (۴)

**راقم:** حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو تغلب کے دہری زکوۃ ادا کرنے پر کہا تھا «**هذه جزية سموها ما شئتم**»۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ آپ "جدید عربی" کہہ لیں یا "عربی زبان کا جدید دور" تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ عصر حاضر کی عربی ماضی کی قدیم عربی سے بہت سی چیزوں میں مختلف ہو چکی ہے اور یہ اختلاف غیور اہل زبان عرب علماء کے بقول عربی زبان کے مزاج و مذاق سے ہٹا ہوا ہے اور فرنگی اسالیب و تراکیب اور اس کے قالب و سانچے کے موافق ڈھلا ہوا ہے۔ جیسا کہ مکرر سہ کرر گزر چکا۔

**تبصرہ نگار:** مصنف کتاب نے دور حاضر کے تمام ادباء کو مجروح کرنے کے بعد نثر اور نظم کی کچھ قابل مطالعہ کتابوں کی نشاندہی کی ہے جس میں ایک بھی کتاب عصر حاضر کی نہیں ہے... یہیں سے یہ سوال جنم لیتا ہے کہ جن کے کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے اور تعبیرات پر تبصرہ کرنے میں انہیں معیار بنایا گیا ہے ان کتابوں کے مصنفین اور ان کی کتابیں بھی اگر غیر معتبر ہیں، تو تعبیرات کے باب میں وہ کیسے حجت بن گئے؟ اور اگر وہ معتبر ہیں تو موجودہ وقت کے معتبر ادباء اور معتبر کتابوں کی فہرست بنا کر انہیں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟ (ص ۴)۔

**راقم:** ہمیں قلق تو اس بات کا ہے کہ آپ نے مؤلف کی کتاب عجلت میں کیوں پڑھی اگر آپ پورے اطمینان و سکون سے اس کا مطالعہ کرتے تو مؤلف کی صفحہ ۱۳۱-۱۳۴ پر "اہم تنبیہ" کے عنوان سے یہ عبارت آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتی کہ: "ہم نے علماء عرب کی جو عبارتیں اس کتاب میں نقل کی ہیں ان میں سے بھی بہت سی عبارتیں اغلاط و فرنگیات پر مشتمل ہیں؛ بلکہ بارہا ایسا

ہوا ہے کہ مصنف نے کسی لفظ یا ترکیب کو غلط قرار دیا پھر وہی لفظ یا ترکیب خود مصنف کی عبارت میں آگئی۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ان علماء نے عامیت اور عرنگیت کے ماحول میں پرورش پائی ہے اس لیے وہ چاہ کر بھی اغلاط سے نہیں بچ پاتے ہیں۔ البتہ دینی غیرت کی وجہ سے انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں اس بات پر وہ امت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں؛ کیونکہ انہوں نے اپنی بساط کے مطابق عرنگیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے کتابیں لکھی ہیں۔ (ص ۴۳۲)۔

الغرض ان مصنفین نے قدیم عربی اور قدیم ادباء کو سامنے رکھ کر جن تعبیرات کی غلطیوں پر پورے تیقظ کے ساتھ تنبیہ کی ہے وہ تو بالکل معتبر ہے؛ لیکن لکھتے لکھتے جہاں نادانستہ طور پر وہ خود وہی غلط تعبیرات استعمال کر گئے ہیں۔ انہیں حجت نہیں بنایا جاسکتا۔ «خذما صفا ودع ما كدر»۔

**تبصرہ نگار:**... "جدید" دور کی صفت ہے، نہ کہ عربی کی، تخفیفاً اور مجازاً اسے "جدید عربی" کہہ دیا جاتا ہے۔ (ص ۴)۔

**راقم:** یعنی آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ادوار تو بدلتے رہے۔ قدیم اور جدید ہوتے رہے؛ لیکن عربی جوں کی توں قدیم رہی بس دور کے جدید ہونے کی وجہ سے مجازاً اسے بھی جدید عربی کہہ دیا جاتا ہے۔ محترما! اگر بات یہی ہے تو ادوار کی یہ تقسیم تو مطلق تاریخ کی کتابوں میں ہونی چاہیے۔ ادوار کی یہ تقسیم "عربی ادب کی تاریخ" میں کیوں کی جارہی ہے؟ اس کا واضح اور آسان سا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ادوار کی یہ تقسیم خود عربی زبان میں تقلبات اور تطورات کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ جس میں سے "جاہلی دور" اور "اسلامی دور" تو اس کی قدامت اور حجیت کا دور ہے۔ عباسی دور کی تین دہائیوں کے بعد اس کی حجیت ختم ہو گئی۔ پھر ترکی دور میں اس کی قدامت پر کچھ زد آئی۔ اور جدید دور میں وہ فرنگیت سے شکستہ ہو کر اپنی قدامت و حجیت دونوں ہی کو خیر باد کہہ چکی۔ (تفصیل ملاحظہ ہو مؤلف کی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر)۔

**تبصرہ نگار:** پوری تاریخ عربی زبان و ادب میں نئے الفاظ کی وضع یا دیگر اقوام کے علوم و لغات کی اصطلاحات کو عربی کا جامہ پہنانے کو نہ غیروں کی سازش کہا گیا اور نہ ہی اسے عربی کی

تحریف کا نام دیا گیا۔ (ج۸)

**راقم**: اس دور میں بھی نہ "غیروں کی سازش" کہی جاتی اور نہ ہی "عربی زبان کی تحریف" اگر نئے الفاظ کی وضع یا دیگر اقوام کے علوم ولغات کی اصطلاحات کو عربی کا جامہ اس طرح پہنایا جاتا کہ وہ عربی زبان کے مزاج و مذاق کے مطابق ہوتا؛ لیکن المیہ تو یہ ہے کہ "عصر حاضر میں عربوں نے نئی نئی ایجادات کے لیے الفاظ وضع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی؛ بلکہ بے شمار انگریزی اور فرانسیسی الفاظ کو بعینہ عربی میں ٹھونس دیا۔ جن کی وجہ سے آج عربی زبان کا حلیہ بگڑ گیا۔ (ص ۲۹۲)۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں علم الحیاۃ کے لیے «البیولوجیا» علم النفس کے لیے «السیکولوجیا» اور علم الارض کے لیے «الجیولوجیا»۔ (ص ۲۹۴)۔

**تبصرہ نگار**: دور جدید جس کا آغاز ۱۷۹۸ء سے ہے۔ جب... مسلم قوم اور ان کے مقدسات پر لسانی، تہذیبی اور فکری حملے ہوئے... زبان وادب کے حوالے سے بھی متعدّد چیلنجز سامنے تھے... مگر ایسے مخلصین بھی بڑی تعداد میں رہے جو پوری ثابت قدمی کے ساتھ... عربی زبان کی بے مثال استیعابی صلاحیت کے علمبردار رہے، اس حوالے سے انہوں نے... تمام سازشوں کو بے نقاب اور ناکام کیا۔ عربی زبان وادب نے ان مخلصین کی محنتوں سے حیرت انگیز ترقی کی، اس کا دامن ادبی شہ پاروں اور فنی شاہکاروں سے لبریز ہو گیا، ان شاہکاروں میں اخبارات و مجلات بھی ہیں، لغوی اکیڈمیاں بھی ہیں، معاجم و قوامیس کا سلسلہ بھی ہے، شعرا کے دواوین اور ادباء کی حیرت انگیز تخلیقات بھی ہیں... اور ذرائع ابلاغ کی کثرت اور بہتات بھی ہے۔ (جائزہ ص ۱۰)۔

**راقم**: تبصرہ نگار جن ذرائع کو فنی شاہکاروں میں شمار کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو "در حقیقت عربی زبان کی سب سے بڑی قتل گاہیں ہیں" چنانچہ مؤلف کتاب نے باضابطہ ایک باب ہی اس کے لیے مختص کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: "چھٹا باب: عربی زبان کی تین قتل گاہیں" ان میں سے "پہلی قتل گاہ: صحف و مجلات اور ذرائع ابلاغ" ہیں۔ "دوسری قتل گاہ: مجامع اللغۃ خصوصًا قاہرہ کی مجمع اللغۃ" ہے۔ اور "تیسری قتل گاہ: جدید معاجم اور قوامیس" ہیں۔ مؤلف نے "پہلی قتل گاہ کو

"صحف ومجلات کی دجل کاریاں" کے عنوان سے، دوسری قتل گاہ کو "مجامع اللغۃ کی کارستانیاں" کے عنوان سے، اور تیسری قتل گاہ کو "جدید معاجم اور قوامیس کی ملمع سازیاں" کے عنوان سے بیان "کیاہے۔(ص۳۸۶)۔اور کوئی ایک بات بھی اہل زبان عرب علماء کے حوالے کے بغیر نہیں کہی۔(ملاحظہ ہو صفحہ ۳۸۶تا۴۱۳)۔

رہے "شعراء کے دواوین اور ادباء کی حیرت انگیز تخلیقات "توان کی شاہ کاریوں پر مشہور ادیب علی طنطاوی کا «البواکیر» اور «فکر ومباحث» میں یہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیے: «بل إني لأسمع اللحن من أفواه الأدباء وأقرؤه في كتبهم. المجلات مملوءة باللحن، والقصص المطبوعة مملوءة باللحن، والكتب الجديدة مملوءة باللحن، وممن سماهم الناس أدباء وشعراء من لا يستطيع أن يكتب صفحة واحدة صحيحة، ولا يقدر أن يقيم لسانه في صفحة واحدة» (بلکہ میں ادبا کی زبانوں سے بھی غلطی سنتا ہوں اور ان کی کتابوں میں پڑھتا ہوں۔ مجلات غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مطبوعہ قصے غلطیوں سے لبریز ہیں۔ جدید کتابیں غلطیوں سے پر ہیں۔ لوگ جن کو ادباء یا شعرا کہتے ہیں ان میں سے بھی بعض ایسے ہیں جو ایک صفحہ "صحیح عربي" میں نہیں لکھ سکتے اور ایک صفحے میں اپنی زبان وعربي کو درست نہیں رکھ سکتے)۔(از کتاب مؤلف ص۳۸۹)۔

**تبصرہ نگار:** فصحیٰ یعنی فصیح عربي زبان دراصل، قدیم عربي کا تسلسل ہے، اس کی بنیاد عربي کے طے شدہ ضابطے،(اور) نحو وصرف کے مقررہ قواعد پر قائم ہے۔(ص۱۰)۔

**راقم:** مؤلف نے کتاب عامی لہجات کے تعلق سے نہیں لکھی؛ بلکہ وہ عرب علماء کی تقلید میں "فصحیٰ" ہی کو "جدید عربي"؛ بلکہ "فرنگی عربي" کا نام دے رہے ہیں۔ چنانچہ مؤلف احمد الغامدی کی «العرنجية» اور عارف حجاوی کی «اللغة العربية» کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: "جدید عربي: وہ سازشی محرف زبان ہے جو عربي حروف، فرنگی تراکیب اور لسانی غلطیوں سے مرکب ہے اور متعدّد ناموں سے موسوم ہے، جیسے: جدید عربي - «العربية المعاصرة» - «العربية الفصحى» -

«الفصحى المعاصرة»"۔ (ص ۱۳۱)۔

رہا اس کا نحوی و صرفی قواعد پر قائم رہنا تو خود مؤلف نے اپنی اس کتاب میں اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے بھی مستقل ایک باب قائم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "پانچواں باب: جدید عربی لسانی غلطیوں کا سنگم" اور اس باب میں مؤلف نے غیور اہل زبان عرب علماء کی کتب کے حوالوں سے صرف "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر لغوی و صرفی تحریفات کی ۱۶۴ مثالیں، نحوی تحریفات کی ۹۳ مثالیں، صلات کی تحریفات کی ۹۲ مثالیں اور اصطلاحات کی تحریفات کی ۵۳ مثالیں ذکر کی ہیں۔ جب صرف نمونے کے یہ اعداد و شمار ہیں تو مکمل جائزہ اور پورے استیعاب و استقصاء کا کیا عالم ہو گا!۔

**تبصرہ نگار:** دور جدید کے مخلص ادباء... کے نظریات کا خلاصہ یہی ہے کہ... جدید تقاضے کے مطابق کچھ کلمات اور تعبیرات کو شامل کرنے کی ضرورت پڑے گی تو وہ بھی عربی قواعد اور اصول کے مطابق شامل ہوں گے۔ (ص ۱۱)۔

**راقم:** عربی قواعد و اصول سے اگر آپ کی مراد صرف "نحوی اور صرفی قواعد اصول" ہیں، تو ہمیں یہ تسلیم نہیں؛ اس لیے کہ کسی کلمہ اور کلام کے عربی ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو تو پھر علم الحیاۃ کے لیے «البیولوجیا» علم النفس کے لیے «السیکولوجیا» اور علم الارض کے لیے «الجیولوجیا» اسی طرح "زید شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا" کے لیے «صار زید ماء ماء من ضرب الخجل» اور "تم لوگ مار کھاؤ گے" کے لیے «أنتم تأكلون الضرب» اور "میں نے غصے کو پی لیا" کے لیے «أنا شربت الغضب» بھی خالص فصیح عربی تعبیر ہونی چاہیے؛ کیونکہ ان کلمات اور جملوں میں نہ کوئی نحوی غلطی ہے اور نہ ہی کوئی صرفی غلطی۔

پتہ چلا کہ "صرف الفاظ کے عربی ہونے اور جملے کے موافق نحو ہونے سے فصیح عربی کا وجود نہیں ہوتا؛ بلکہ جملے کا عربی تراکیب اور عربی قالب میں ہونا بھی ضروری ہے" (ص ۱۴۵)۔

شیخ ترجمان احمد الغامدی صاحب لکھتے ہیں: «وليست الفصيحة بموافقة النحو وعروبية الألفاظ، بل بألفاظها ومعانيها ونحوها وأساليبها واستعمالاتها» (یعنی فصیح عربی زبان

صرف نحو کی موافقت اور الفاظ کے عربی ہونے سے ہی نہیں بنتی؛ بلکہ فصیح عربی زبان اپنے الفاظ، معنی، نحو، لب و لہجے اور استعمالات سبھی چیزوں سے مل کر بنتی ہے)۔ (از کتاب مؤلف ص ۱۴۵)۔

**تبصرہ نگار**: ... اور حسب ضرورت کلمات کے مفاہیم کی تعیین جدید بھی کی جائیں گی۔ (ص ۱۱)

**راقم**: اگر یہ تعیین عربی زبان کے مزاج و مذاق سے مکمل آشنا غیور اہل زبان عرب علماء کرتے تو بات قابل ہضم ہو سکتی تھی؛ لیکن یہاں تو ساری تعیینات عربی زبان کی تین سب سے بڑی قتل گاہوں میں ہو رہی ہیں۔ (جس کو ہم نے ماقبل میں بیان کر دیا ہے۔) اور اہل زبان غیور عرب علماء اس پر زبردست نقد کر رہے ہیں، تو پھر ایسی "تعیینات جدیدہ فرنگیہ غیر معتبرہ" ہم عجمی کیوں کر قبول کر سکتے ہیں؟

**تبصرہ نگار**: علمی اور ادبی اسلوب میں... لکھنے والوں کے یہاں ایسی تعبیرات و کلمات ضرور مل جائیں گے، جو کثیر الاستعمال ہیں، چاہے ماضی میں اس کا شیوع کم ہو یا اس کے مفاہیم میں قدرے تبدیلی آگئی ہو، اور یہ کوئی عیب نہیں، یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ (ص ۱۲)

**راقم**: بات صرف اتنی نہیں ہے کہ "ماضی میں اس کا شیوع کم" تھا اور اب زیادہ ہو گیا ہے؛ بلکہ پوری اور اصل بات وہ ہے جس کو آپ نے اس کے معًا بعد ذکر کیا ہے کہ "لسانی تقویم اور اصلاح پر تصنیفی کام کرنے والے زیادہ تر حضرات کے پیش نظر وہ تعبیرات رہی ہیں جن کا فصیح عربی متبادل موجود ہے اس کے باوجود لوگ شاذ کلمات کا استعمال کرتے ہیں یا نحوی صرفی قواعد کی بے جا خلاف ورزیاں کرتے ہیں یا صلات کی غلطیاں کرتے ہیں۔ (ص ۱۲)

اور ضابطہ ہے «**العبرة بما عم و غلب لا بما شذ و ندر**» تو جب شذوذ کا اعتبار ہی نہیں ہے تو جان بوجھ کر عصر حاضر کی مجامع کا ایسے شاذ کلمات کے رواج کی منظوری دینا چہ معنی دارد!۔ بلکہ ہمیں کہنے دیجئے کہ یہ واضح طور پر مستشرقین کی سازش ہے کہ وہ قدیم عربی کا حلیہ بگاڑنے کے من جملہ اور طریقوں کے یہ طریقہ بھی اپنا رہے ہیں کہ فصیح کا خاتمہ کیا جائے اور شاذ کو عام و رائج کیا جائے۔

چنانچہ مؤلف نے چوتھے باب میں "فصیح کا خاتمہ اور شاذ و غلط کی ترویج" کا عنوان قائم کر کے عربی کتب کے حوالے سے نمونے کے طور پر ایسی ۹۴ مثالیں پیش کر دی ہیں اور مستشرقین کی سازش کو بے نقاب کر دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۵)۔

# نتیجہ جائزہ

# اور

# تاثر راقم

راقم نے یہ پورا تبصرہ اور جائزہ صرف مؤلف کی کتاب "عربی حروف میں فرنگی زبان" کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ جس کے نتیجہ میں راقم کا یہ تاثر قائم ہوا کہ تبصرہ نگار اور ان کے تبصرہ سے مغالطہ میں پڑنے والے حضرات اگر مؤلف کی کتاب بالکل غیر جانبدار ہوکر، از اول تا آخر، پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھ لیں تو یہ اور اس طرح کے بہت سارے اشکالات و اعتراضات پیدا ہونے سے پہلے ہی دفن ہوجائیں۔

**ملاحظہ**: "واضح رہے کہ راقم کا مقصود بھی صرف اظہار و ابلاغ ہے کسی کی حق تلفی اور کسی کی ذاتی مخالفت راقم کا مقصود نہیں ہے"۔

«وما علينا إلا البلاغ»

«وإن أريد إلا الإصلاح ما استطعت»

«وما توفيقي إلا بالله»

«عليه توكلت وإليه أنيب»